R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29

Annual Rs. 4/-

Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۵ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | یکم فروری ۱۹۶۷ء

آل احمد سرور

وزیر اعظم سے انجمن کے وفد کی ملاقات

وزیر اعظم نے پہلے ۱۰ دسمبر انجمن کے وفد سے ملنے کی تاریخ مقرر کی تھی۔ لیکن ان کی علالت کی وجہ سے یہ تاریخ بدلنی پڑی۔ اس کے بعد عام چناؤ کے سلسلے میں انھیں کئی دفعہ دہلی سے باہر جانا پڑا۔ کئی یاددہانیوں کے بعد بالآخر ۲۱ جنوری کو دوپہر کو ملاقات ہوئی۔ وفد حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھا۔

۱۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو	(صدر انجمن)
۲۔ ڈاکٹر عابد حسین	نائب صدر
۳۔ پنڈت سندر لال	نائب صدر
۴۔ کرنل بشیر حسین زیدی	ایم۔ پی
۵۔ حیات اللہ انصاری	ایم۔ پی
۶۔ حمیدہ سلطان	(رکن مرکزی انجمن)
۷۔ گوپی ناتھ امن	(رکن مرکزی انجمن)
۸۔ پروفیسر آل احمد سرور	(جنرل سکریٹری انجمن)

ڈاکٹر تارا چند اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔

وزیر اعظم کی خدمت میں انجمن نے صدر جمہوریہ کے نام دو محضر نامے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام عرضداشت، لال بہادر شاستری کے نام عرضداشت اور اس اعلان کا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا جو انجمن کے نزدیک صدر جمہوریہ کو دفعہ ۳۴۷ کے تحت جلد سے جلد جاری کرنا چاہیے۔

پنڈت کنزرو نے تفصیل سے انجمن کے مطالبات بیان کیے۔ انھوں نے لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی ساتویں رپورٹ کے اقتباسات پڑھ کر سنائے اور دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ کئی ریاستیں خصوصاً اتر پردیش اور بہار نہ دستور میں دیے ہوئے تحفظات کی پروا کرتی ہیں نہ حکومت ہند کے احکام کا، نہ خود اپنے اعلانات کی پاسداری کرتی ہیں اور نہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی سفارشات پر توجہ کرتی ہیں، بلکہ کسی نہ کسی بہانے سے ایسی صورت حال پیدا کرتی ہیں جن میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد برابر کم ہو رہی ہے اور ان کے لیے دشواریاں بڑھ رہی ہیں۔ انھوں نے زور دے کر وزیر اعظم سے کہا کہ اب سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ وزیر اعظم صدر جمہوریہ کو دفعہ ۳۴۷ کے تحت کارروائی کرنے کا مشورہ دیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ دوسری ریاستوں میں بھی اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے مگر اتر پردیش، بہار اور دہلی میں یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے صدر جمہوریہ کو ان علاقوں میں اردو کو فوراً سرکاری زبان تسلیم کر لینا چاہیے اور ان تمام اغراض کے لیے جو مسودے میں درج ہیں واضح احکام جاری کرنے چاہئیں۔ مسودے میں حسب ذیل امور کے سلسلے میں واضح ہدایات کا مطالبہ کیا گیا تھا:۔

۱۔ مکمل ابتدائی تعلیم مادری زبان میں

۲۔ ثانوی منزل پر مادری زبان کے ذریعے سے تعلیم دینے کی مناسب سہولتیں خصوصاً سرکاری اسکولوں میں۔

۳۔ اس سلسلے میں اساتذہ کی تربیت اور کتابوں کی فراہمی کا پورا انتظام۔

۴۔ سہ لسانی فارمولے میں مادری زبان کا لازمی انتظام۔

۵۔ اردو میں عدالتوں میں اور دفتروں میں درخواستیں قبول کرنے اور اردو میں جواب دینے کا انتظام۔

۶۔ سرکاری اعلانوں، قوانین، گشتیوں، انتخابی فہرستوں، شاہراہِ عام پر کتبوں وغیرہ کے لیے اردو کا بھی انتظام۔

۷۔ ان ضلعوں، شہروں یا تحصیلوں میں جہاں دس فی صدی آبادی اردو داں ہے سرکاری کاغذات اردو میں بھی رکھنے کا التزام۔

۸۔ اتر پردیش، بہار اور دہلی کی مجالس قانون ساز میں اردو کے استعمال کی اجازت اور ان کی روداد اردو میں بھی چھاپنے کی سہولت۔

۹۔ مقابلے کے امتحانوں میں اردو میں جواب دینے کی اجازت۔

۱۰۔ ایک ایسا ڈھانچہ وضع کرنا کہ صدر جمہوریہ کے منشا کی دیکھ بھال ہو سکے اور شکایات کا ازالہ ہو سکے۔

وزیر اعظم نے نہایت ہمدردی اور توجہ سے پنڈت کنزرو کی تقریر اور ممبران وفد کے معروضات سنے۔ انھوں نے کہا کہ وہ چاہتی ہیں کہ اس سلسلے میں مناسب کارروائی جتنی جلد ہو سکے کی جائے، انھوں نے

کہا کہ اگرچہ صدر جمہوریہ کو اختیار ہے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اعلان کردیں لیکن جہاں تک اتر پردیش اور بہار کا معاملہ ہے اور اصل صدر کے احکام پر عمل ان ریاستوں کو کرنا ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ ان ریاستوں کے ارباب حل وعقد سے ہر پہلو پر تبادلۂ خیالات ہو جائے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ دونوں ریاستوں کے بڑے وزیروں سے بات چیت شروع کر چکی ہیں لیکن ابھی یہ سلسلہ مکمل نہیں ہوا ہے اور اس میں کچھ وقت اور لگے گا۔ جہاں تک دہلی کا معاملہ ہے اس پر پہلے کارروائی ہو سکتی ہے اور وہ اس سلسلے میں متعلقہ حضرات سے جلد ہی بات چیت کریں گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دراصل نگرانی کا سوال بہت اہم ہے اور وہ یہ سوچ رہی ہیں کہ نگرانی کا قرار واقعی انتظام ہو جائے تو بہت سی شکایات دور ہو سکتی ہیں۔

ممبران وفد نے پھر اس پر زور دیا کہ اس معاملے میں ویسے بھی بہت دیر ہو گئی ہے اور اردو کے ساتھ "ناانصافی" کا سلسلہ برابر جاری ہے جس کی وجہ سے اردو دوستوں میں بددلی اور احساس شکست عام ہو رہا ہے اور یہ ملک کی ترقی کے لیے نقصان دہ ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ انھیں ان تمام باتوں کا احساس ہے اور وہ جلد ہی اس سلسلے میں مناسب کارروائی کریں گی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے وزیر تعلیم نے بھی ہمیں اس سلسلے میں مشورہ دیا ہے جو زیر غور ہے۔

وفد اگرچہ وزیر اعظم کو فوری کارروائی کرنے پر آمادہ نہ کر سکا مگر اس تاثر کے ساتھ واپس آیا کہ انھیں صورت حالات کا پورا اندازہ ہو گیا ہے اور وہ واقعی چاہتی ہیں کہ اردو دوستوں کی جائز شکایات دور ہوں اور اردو کو پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملے تاکہ وہ قومی زندگی کی تشکیل میں اپنا قرار واقعی رول ادا کر سکے۔

اب ہماری مجلس عاملہ عنقریب اس پر غور کرے گی کہ ہم اس سلسلے میں آئندہ کیا اقدامات کریں۔ مجلس عاملہ کا جلسہ ۱۸ فروری میں دہلی میں ہو رہا ہے۔ انجمن کی جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اس کے سارے مطالبات منظور نہ ہو جائیں۔

خواجہ غلام السیدین اور علی سردار جعفری کیلئے اعزاز

نئی دہلی۔ صدر جمہوریہ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر چار اصحاب کو پدم وبھوشن کا اعزاز دیا۔ پدم وبھوشن پانے والوں میں مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین اور ملک راج آنند بھی شامل ہیں۔

پدم شری کا اعزاز جن لوگوں کو ملا ہے ان میں علی سردار جعفری بھی شامل ہیں۔ (سیاست جدید، کانپور)

دہلی میں جشن فراق

دہلی۔ اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے اعزاز میں یہاں "جشن فراق" منایا گیا۔ جشن فراق جمعہ کے دن کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کے اہتمام میں منایا گیا۔

فراق کی شاعری، فن اور شخصیت پر ایک دو سو صفحات کا صحیفہ فراق کو خواجہ غلام السیدین نے پیش کیا۔

اس موقع پر ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے "اردو شعر و ادب کے لیے فراق کی خدمات" پر ایک مباحثہ میں حصہ لیا۔

فراق صاحب نے جو ۷۰ برس کے ہو گئے ہیں اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے شاعری میں ہمیشہ "زندگی کی زبان" استعمال کی ہے۔ اور شاید میری تھوڑی بہت شہرت کا راز یہی ہے۔ (قومی آواز)

ماہنامہ "پونم" کا خصوصی طنز و مزاح نمبر

مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ۱۴ اور ۱۵ مئی ۱۹۶۶ء کو حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی۔ اس یادگار کانفرنس سے متعلق ماہنامہ "پونم" کا خصوصی نمبر جنوری ۱۹۶۷ء کے دوسرے ہفتے میں منظر عام پر آیا۔ اس نمبر میں کانفرنس کی مکمل روداد اور مباحث کے علاوہ ملک کے ۲۰ ممتاز مزاح نگاروں کی مزاحیہ تخلیقات شامل ہیں۔ جن میں قابل ذکر کرشن چندر، غلام احمد فرقت کاکوروی، ولاور فگار، سلمیٰ صدیقی یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، احمد پاشا، بھارت چند کھنہ، مرزا شکور بیگ، سلیمان خطیب، مجتبیٰ حسین اور علامہ بے نام ہیں۔ کانفرنس کے بارے میں محترمہ سلمیٰ صدیقی اور مجتبیٰ حسین کے دو دلچسپ رپورتاژ بھی اس نمبر کی زینت ہیں۔ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال اور مزاحیہ شعرا کی تخلیقات بھی اس میں شامل ہیں۔

روسی زبان میں فیض احمد فیض کا مرتب کردہ افسانوی انتخاب

ماسکو۔ پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں کے ۱۴ نمائندہ افسانوں کا انتخاب جسے فیض احمد فیض نے مرتب کیا ہے گذشتہ دنوں ماسکو سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں منٹو کے تین افسانے 'نیا قانون'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، اور موذیل۔ احمد ندیم قاسمی کے تین افسانے 'پرمیشر سنگھ'، 'الحاؤن اور بچے'، اے حمید کا افسانہ 'بارش میں ملاقات'، ابوالفضل صدیقی کا 'واپسی' پطرس کا 'مرید پور کا پیر'، حمید اختر کا 'آخری رات'، شوکت صدیقی کا 'تیسرا آدمی'، قدرت اللہ شہاب کا 'ماں جی'، غلام عباس کا 'آنندی' اور ہاجرہ مسرور کا 'موت اور دودھ' شامل ہے۔ یہ مجموعہ تین ہزار کی تعداد میں چھاپا ہے اور اسے غیر ملکی لٹریچر پبلشرز ماسکو نے شائع کیا ہے۔ (انکار)

علامہ اقبال کا آبائی مکان

سیالکوٹ۔ یہاں کی میونسپل کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے علامہ اقبال کے آبائی مکان کو قومی یادگار بنانے کا مطالبہ کیا ہے قرارداد میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ خصوصاً غیر ملکی سیاح علامہ اقبال کے آبائی مکان کی زیارت کرنا چاہتے ہیں انھیں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ اسے خرید کر قومی یادگار قرار دے دیا جائے۔ (انکار)

ڈاکٹر سید محمد حسنین

انشاء پردازی

ادب میں تاثرات کی ترجمانی ملتی ہے، ایسی دلکش و فکر بخش ترجمانی جس میں انشاء کی بہار اور نکھار ہوتی ہے۔ ادیب کا عمدہ وصف انشاء پردازی ہے۔ یہ اس کی ادبی شخصیت کا پہلا جلوہ ہے۔ ایک کامیاب ادیب باکمال اور ماہر انشاء پرداز بھی ہوتا ہے۔ اس کی قلم کاری کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔

انشاء کے معنی عبارت یا تحریر ہے اور انشاء پردازی سے مراد لکھنے کا سلیقہ یا لکھنے کی مہارت ہے۔ جب ہم کسی بات کے اظہار کی خلش محسوس کرتے ہیں، تو اس کی ادائیگی یعنی 'ابلاغ' (Transmition) میں دو طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ابلاغ کا زبانی یا لسانی طریقہ 'کلام' یا گویائی ہے۔ ابلاغ کا غیر زبانی طریقہ تحریر یا انشاء ہے۔ انشاء پردازی گویا خیالات و تاثرات کی قلم بندی ہے جس سے کہنے والے کا مفہوم و مطلب لفظی پیرہن میں ملبوس ہوکر تحریری صورت اختیار کرلیتا ہے۔

نوشت و خواند ہماری متمدن و مہذب زندگی کی پہلی تصویر ہے ہم اگر پڑھنا جانتے ہیں تو لکھنا بھی جانتے ہیں جس زبان کو ہم پڑھ سکتے ہیں اس زبان میں، عام طور پر، ہم میں لکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے کسی بات یا خیال کو صاف ستھری تحریر میں منتقل کردینا ہماری اچھی قوت انشاء کی علامت ہے۔ یہ تحریر صحیح اور درست زبان کی نمونہ کہی جائے گی، پر یہ ادب یا فن میں شمار نہ ہوگی۔ انشاء پردازی خیالات و تاثرات کو قلم بند کرلینے کی صلاحیت ہے یہ صلاحیت مگر غیر معمولی لیاقت میں شمار نہ ہوگی۔ خرید و فروخت کے اعلانات، مجرموں کے بیانات، ادویات کے اشتہارات بھی تحریریں یا قلم بند باتیں ہیں، یہ بھی انشاء کا نمونہ ہیں۔ پر یہ تحریریں یا اس نوع کی قلم بندیاں داخل ادب نہیں، وجہ ظاہر ہے۔ ہر خواندہ اپنے خیالات کے زبانی یا تحریری اظہار کی صلاحیت رکھتا ہے مگر خیال کے دلکش اظہار کی لیاقت ہر فرد میں نہیں ہوتی۔ آپ جانتے ہیں، ہر باورچی روٹی بنا سکتا ہے، مگر عمدہ، نفیس ورق گل جیسی چپاتیاں بنانا ہر باورچی کے بس کی بات نہیں۔

تو ادیب کے لیے انشاء پردازی شرط ہے۔ انشاء پردازی مگر محض بات کی قلم بندی نہیں۔ عام انشاء اور ادبی انشاء میں فرق ہے اور کافی فرق ہے۔ ان میں وہی دوری ہے جو کلام اور خطبہ میں ہے۔ باتیں کرنی آسان ہے، مگر خطابت آسان نہیں۔ خط لکھنا عام بات ہے مگر خیر و خیریت کی قلم بندی کو پارۂ ادب بنا دینا غیر معمولی بات ہے۔ انشاء پردازی نفیس اور اعلیٰ انشاء پردازی ایک ادیب کی لیاقت ہے، ہر خواندہ کی صلاحیت قلم بندی نہیں۔ یہ وہ ہنر ہے جس سے بات کو خوشنما تحریری ملبوسات حاصل ہوجاتے ہیں۔ تحریر پھر صاف ستھری زبان نہیں رہتی اس میں رونق اور دلگیری آجاتی ہے۔ اسے ہماری سماعت و بصارت سے براہ راست ایک لطیف رشتہ قائم کرلینے کی صلاحیت میسر ہوجاتی ہے۔ یہی انشاء ادبی انشاء کی جاذبیت ہے، جو ادیب کی جنبش قلم کا کمال ہے۔

> "خاندان تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل دن ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشہ میں بھی روک نہ ہوسکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا۔
>
> میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں، جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پئے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا۔"
>
> (آزاد — ترجمان القرآن)

دیکھیے اس عبارت میں جو باتیں قلم بند کی گئی ہیں، یہ ستھری زبان اور اچھا بیان ہی کا نمونہ نہیں۔ اس تحریر میں ایسی کشش، ایسی جاذبیت اور دلگیری ہے جو قلب و نظر دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ قلم بند باتیں ہمارے فہم و ادراک کو دعوت دیتی ہیں۔ نفیس و اعلیٰ انشاء پردازی ہی ان کے لطف و کیف کا سبب ہے۔

انشاء پردازی کا ایک جانا پہچانا نام 'عبارت آرائی' بھی ہے جو تحریر کی تزئین و آرائش ہے۔ عبارت آرائی میں تحریر کی ساخت و تشکیل پر نہایت ماہرانہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں الفاظ کی خوش ترتیبی [illegible] کی خوش آہنگی اور مجموعی آراستگی پر دھیان رکھا جاتا ہے، جس سے تحریر یا عبارت کی جمالیاتی ہیئت میں گوناگوں اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ ایسی قلم بندی ہے جس میں خیال اور اظہار (EXPEESSION) کی عضویاتی تعمیر (ORGANIC CONSTRUCTION) پر توجہ نہیں دی جاتی، وہ عضویاتی تعمیر جس میں مواد اور اسلوب کا اختلاط و اتحاد ہوتا ہے — عبارت آرائی میں تحریر کے مصنوعی تقاضوں اور ادب کے فنی ضابطوں سے بے نیازی برتی جاتی ہے۔

غالب ایک بڑے شاعر تھے اور اچھے نثار بھی ان کی ادبی شخصیت کی عظمت کا ایک اہم سبب ان کی نفیس و اعلیٰ انشاء پردازی بھی ہے اس راہ میں محمد حسین آزاد اور حلیم شرر ان سے کئی قدم آگے تھے۔ الفاظ کے گل بوٹے سے تحریر کو جاذب نظر بنا دینا، بے بات کی بات میں دلکشی پیدا کرنے کا ہنر یہ باکمال نثار خوب جانتے تھے

لہ زیر اشاعت تصنیف نگار ادب کا ایک حصہ

کہا جاتا ہے کہ منشی ہرگوپال تفتہ کی سخت فرمائش پر غالب نے ان کے مجموعۂ کلام پر تقریظ لکھی۔ تفتہ کو گرامی استاد کی یہ تقریظ پسند نہ آئی۔ اس تحریر کو انھوں نے "چھلکے کے اندر چھلکے" قرار دیا۔ بات درست تھی غالب کے قلم سے جو بات بصورت تقریظ ضبطِ تحریر میں آئی، یہ دراصل غالب کی انشا پردازی کا نمونہ تھی۔ اس تحریر میں عبارت آرائی کا دخل زیادہ تھا، اہم دنیا کا [illegible] متعلق امور کا اندراج نہ تھا یا کم تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ غالب نے اس تحریر میں خیال سے نہیں بیان سے رونق پیدا کی تھی۔ عبارت آرائی الفاظ کا کھیل ہے، جسے اہلِ قلم کی بازی گری کہہ سکتے ہیں۔ اس کاوش کو ادب یا فن کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

ادب میں انشا پردازی شرط ہے، اکثر ادیب اس لیے انشا کی طرف زیادہ مائل ہو جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ افکار و نثر کی پذیرائی کا نمایاں سبب انشا کی خوبیاں اور محاسن ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ زبان کا لطف، خوبصورت الفاظ، ترکیبوں کی بندش، تراشیدہ فقرے، مترنم جملے، محاورات، ضرب الامثال کا استعمال، اندازِ بیان کی روانی، زور اور زیر و بم، نثری آہنگ، یہ تمام خصوصیات بلاشبہ عبارت یا تحریر کو بالامتیاز بنا دیتی ہیں، جو پڑھنے والے کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہیں یہ بھی درست ہے کہ ان خصوصیات کے پیشِ نظر ہم ادیب کی ماہرانہ قلم بندی کا بخوبی اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر اس نوع کی قلم بندیاں درحقیقت اہلِ قلم کی مشہوری کا مظہر ہوتی ہیں۔ یہ قلم بندی افکار و نثر کی تحریری جامہ زیبی ہو سکتی ہے، یہ افکار و نثر کی صنفی تخلیق نہیں کہی جا سکتی —— میر انیس کی نادر الکلامی روشن ہے۔ زبان اور بیان پر انھیں جیسی قدرت حاصل تھی، کم شاعروں کو قلم بندی کی یہ لیاقت نصیب تھی۔ خود کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں ۔ ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں ۔ سو کیا، ایک ماہر انشا پرداز کسی مضمون کو کئی سو رنگ میں قلم بند کر سکتا ہے۔ پر یہ اندازِ قلم بندی، آپ مجھ سے اتفاق کریں گے، لفظی بازی گری کہلائے گا اور اس نوع کی تحریر چھلکے کے اندر چھلکے قرار دی جائے گی۔

> "ماہ و سال کی محور پہ گردش کرتے کرتے انیسویں صدی تھک چکی تھی۔ اپنے انقلابات و انکشافات، محاربات سے دنیا کی تاریخ بدل کر اب جا رہی تھی، مگر اس پیرزال کا دفترِ نظم و نسق ہنوز سرگرم تھا، اس کے جاتے جاتے بھی تعمیر و تخریب میں اضافے ہو رہے تھے، سیکڑوں قدریں ابھرتی تھیں، سیکڑوں ڈوبتی تھیں۔ ہزاروں انسان مرتے تھے اور سیکڑوں روزانہ پیدا ہوتے تھے اس کی رحلت اور نئی صدی کی ولادت، دو ہی ایک سال کا وقفہ تھا کہ میرے وجود کو عدم سے ہستی میں آنے کا حکم ہوا۔ ہزاروں لاکھوں بچوں کی طرح اس جاتی ہوئی صدی نے آخری دور میں مجھے بھی جنم دیا، اس کی یہ حرکت خدا جانے تعمیر سے متعلق تھی یا تخریب سے بہرحال اس نے کام کیا اور میں نے نئی دنیا کو سلام کیا۔"
>
> صفحہ ۹ میری دنیا (ڈاکٹر اعجاز حسین)

اس طویل عبارت میں مصنف کا مقصد اپنے سالِ پیدائش کا اظہار تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کی پیدائش کا سال ۱۸۹۸ء کا آخر یا ۱۸۹۹ء کا شروع تھا۔ اتنی سی بات کے اظہار کے لیے مصنف نے اچھی خاصی انشا پردازی کر ڈالی۔ عالمِ حیات میں اپنی آمد کا یہ اظہار انھوں نے دو ٹوک الفاظ میں نہیں کیا۔ اس اظہار میں انشا سے مدد لی گئی ہے اور خوب خوب مدد لی گئی ہے مگر مصنف کی یہ انشا پردازی یا یہ عبارت آرائی الفاظ کی بازی گری نہیں۔ ہر فقرے میں ایک مطلب ہے اور جملے میں اثر و کیفیت بھی۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور ادا کردہ بات کو سمجھتے اور دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ یہ الفاظ یہ فقرے اور یہ جملے کسی طرح عبارت کو گورکھ دھندہ نہیں بناتے اس کے برخلاف اس عبارت کو دیکھیے:

> "غزل غنائی شاعری کا کلاسک ہے، باطنی اور داخلی قدروں کے مطالعہ کے لیے ہم بار بار غزل کی تاریخ کا سہارا لیں گے، یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل ہمارے شعری مزاج میں جتنی رچی بسی ہے کوئی دوسری صنف اتنی رچی بسی نہیں ہے۔ اس کا رشتہ بدلتی ہوئی قدروں سے گہرا رہا ہے اس کے پراسرار اور دلفریب زاویوں میں باطنی اضطراب اور داخلی ہیجانات (IMPULSES) کی ان گنت صورتیں ہیں۔ غزل کی رومانیت اور اس کے پھیلے ہوئے جمالیاتی دائرے میں ذاتی جذبے بھی ہیں اور طبقاتی اضطراب اور سماجی تصادم بھی ہے ہم المیات (TRAGEDY) کی گہرائیوں میں گھومنے لگتے ہیں نشاط انگیزی، لذت اندوزی اور آرزو مندی اور معلوم نہیں کتنے جذبوں اور جبلتوں کو پہچاننے لگتے ہیں۔ عمل اور ردِ عمل کی موجیں ملتی ہیں، نشاطِ غم، جبلتوں کی بیقراری، پراسرار ہیجانات کی کشمکش، ممنوعاتِ ذہنی (TABOOS) کو علامتوں میں دیکھنے کی آرزو، قوتی کردار کا عمل، نفسی بہاؤ (PSYCHIC FLUX) انحراف مرکزیت، توہمات، اندرونی لمحات میں جستجو اور تلاش کا عمل، نرگسی گریز، نرگسی زعم اور نرگسی مرکزیت کی تصویریں کیا نہیں ہے اس پھیلی ہوئی رومانیت اور اس پھیلے ہوئے جمالیاتی دائرے میں علائم حسن پیکر اور آرچ ٹائپ (ARCHE TYPE) نہیں معلوم کتنے اسرار و رموز کو پہچاننے لگتے ہیں۔"
>
> (صفحہ ۱۱ شکیل بدایونی کی شاعری ڈاکٹر شکیل الرحمن)

اس عبارت کو پڑھنے اور بار بار پڑھنے موضوع مشہور فلمی شاعر شکیل بدایونی کی رومانی شاعری کا بیان ہے۔ لکھنے والا شکیل کی شاعری کی

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

انتظار

موسیٰ کلیم

چلی اتر سے پون
لے کے آنچل میں چمن
میں نے پوچھا کہ بتا
وہ نظر آئے تجھے
بولی دیکھا تو نہیں

آئی دکن سے ہوا
ہو گئی مسرور فضا
میں نے پوچھا کہ بتا
وہ کبھی آتے ہیں ادھر
بولی معلوم نہیں

آیا پورب سے ادھر
اڑ کے پنچھی جو کوئی
میں نے پوچھا کہ بتا
ان کو دیکھا ہے کہیں
بولا دیکھا تو نہیں

اٹھی پچھم سے گھٹا
لے کے درشا کا سندیس
میں نے پوچھا کہ بتا
وہ کہیں تجھ کو ملے
بولی کوئی نہ ملا

رات کٹتی ہی رہی
درد بڑھتا ہی رہا
اب یہ معلوم ہوا
کوئی آئے گا نہیں
پھر بھی کہتا ہے یہ دل
اک گھڑی اور ٹھہر
صبح تک دیکھ تو لے

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ کی رفتار

مندرجہ ذیل حضرات اپنے اپنے مقالوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے ناموں کے سامنے ان کے موضوعات لکھ دیے گئے ہیں:۔

۱۔ نسیم قریشی۔ شرر، زندگی اور ادبی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ
۲۔ محمود الحسن۔ "دیوان جرأت" ترتیب و تدوین
۳۔ سیدہ مشی۔ شیفتہ کی ادبی خدمات
۴۔ مرزا عزیز اللہ بیگ۔ دکنی اردو۔ اس کا نشو و نما
۵۔ وقار احمد شہاب جعفری۔ اردو زبان میں انگریزی الفاظ
۶۔ کنول کرشن بالی۔ اردو اور ہندی عروض کا تقابلی مطالعہ
۷۔ افسر قریشی۔ حسرت موہانی۔ نثر اور شاعری
۸۔ عبد الغفار شکیل۔ دکنی اردو کا توضیحی مطالعہ
۹۔ نادر علی خاں۔ اردو صحافت
۱۰۔ محمد عثمان (اطہر پرویز)۔ اردو نثری ادب میں خواجہ حسن نظامی کی خدمات
۱۱۔ واجد علی خاں (جاوید کمال)۔ امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری
۱۲۔ حسن مثنیٰ۔ اردو میں علم الکلام
۱۳۔ مسعود عالم۔ مختصر افسانہ (۱۹۳۶ء سے آج تک)
۱۴۔ اخلاق محمد خاں شہریار۔ اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (انیسویں صدی کے آخر تک)
۱۵۔ انجم عالم۔ عبد الحق۔ علمی و ادبی خدمات
۱۶۔ مسعودہ خاتون۔ راشد الخیری کی ادبی خدمات
۱۷۔ فہمیدہ کبیر۔ اردو ناول میں عورت کا تصور۔ نذیر احمد سے دور حاضر تک
۱۸۔ انجمن آرا بیگم۔ اردو ڈرامے میں آغا حشر کی خدمات
۱۹۔ سید محمد علی کاظمی۔ قاضی عبد الغفار۔ حیات اور کارنامے
۲۰۔ محمد اسمٰعیل حسن خاں۔ اردو شاعری میں جوش کی خدمات
۲۱۔ ذکاء الرب ثریا۔ اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک)
۲۲۔ قیصر جہاں۔ اردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ (۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک)
۲۳۔ اشفاق محمد خاں۔ نذیر احمد کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ
۲۴۔ کوکب قدر سجاد مرزا۔ واجد علی شاہ کی ادبی و تہذیبی خدمات
۲۵۔ غلام محمد ملک۔ اردو کے صوفی شعرا کا تنقیدی مطالعہ (۱۸۵۷ء تک)
۲۶۔ مصباح الحسن۔ اردو نثر پر مغربی طنز و مزاح کے اثرات (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)
۲۷۔ رضیہ سید۔ شمالی ہندوستان میں شعر و شاعری کا لسانیاتی جائزہ
۲۸۔ علی وردی خاں۔ سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات
۲۹۔ جمیلہ بانو۔ اردو غزل میں یگانہ کی خدمات
۳۰۔ عذرا خانم۔ میواتی زبان کا صوتیاتی جائزہ
۳۱۔ ذکاء الدین شایاں۔ اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ
۳۲۔ محمد حسین قریشی۔ انیسویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ
۳۳۔ اصغر عباس۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تنقیدی جائزہ اور اردو صحافت
۳۴۔ قاضی محمد ذکریا۔ نیاز فتح پوری کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ
۳۵۔ محمود حمید نقوی۔ واجد علی شاہ کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ
۳۶۔ محمد طاہر حمید تلمیذ۔ دیوان مہدی علی خاں ذکی کی ترتیب صحیح تعارف تحشیٰ (شعبہ اللہ عبرت نامۂ نما یہ ہے)

عابد رضا بیدار

حاصلِ مطالعہ باتیں

ایران میں پچھلے سال سے شاہنشاہِ ایران کے فرمان کے بموجب نومبر کے مہینے میں ہفتہ کتاب منایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مطالعہ کا ذوق اور شوق پیدا کرنے کے لیے اور کتابوں کو روشناس کرنے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ ایران اگر ہم سے پچھڑا ہوا ملک نہیں تو ہم سے بڑھا ہوا بھی نہیں اور اس قسم کی مصنوعی "کیمپین" والے ذرائع اختیار کرنا شاید ہماری موجودہ ذہنی پسماندگی کے پیشِ نظر ضروری بھی ہے ایران میں شاہنشاہی طرز کی حکومت ہے وہاں اس قسم کے کام حکومت ہی کو کرنا ہوتے ہیں۔ ہم ایک جمہوریت کے شہری ہیں اور اپنی ذہنی پسماندگی میں شاید ہم یہ بھی بھول چکے ہیں کہ اس قسم کے کاموں کی ذمہ داری جمہوریت میں ہر ہر فرد اور ادارے میں ہوتی ہے۔ اگر ہم میں سے کچھ افراد ایسے جی دار نکل سکیں تو انجمن ترقی اردو جیسے ادارے تو کم سے کم ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ اور اس میں ایک تجارتی نفع کا پہلو بھی ہے۔ یہ ہفتہ یونٹ بنا کے ہر شہر اور قریہ میں کیا جا سکتا ہے اور مرکزی طور سے دلی میں۔ یا کم سے کم دلی ہی میں اور اردو کی مطبوعات بڑی تعداد میں اس میں بیچی جا سکتی ہیں۔ (عرصہ ہوا دلیّان بھون میں ایک نمائش ہوئی تھی جس میں کچھ اس قسم کی چیز بھی ضمناً آ گئی تھی)۔ اگر انجمن اور اردو کے ناشر اس سے اتفاق کریں تو یہ مثلاً اس موقع پر منایا جا سکتا ہے جب دلی میں فروری کے آخری ہفتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی برسی منائی جائے۔

ایران میں یہ ہفتہ پچھلے مہینے میں دھوم دھام سے منایا گیا اس سلسلہ میں بعض دلچسپ مفید اور کارآمد مضامین بھی نکلے ان میں سے ایک میں ایران میں کتاب اور کتاب خواں کے سلسلہ میں بعض دلچسپ نکات سامنے آئے۔ مجھے امید ہے ہماری زبان کے قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

ایران میں اسلامی عہد سے قبل مذہبی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کی موجودگی کے ثبوت بھی ہم تک پہنچے ہیں ان میں خدائے نامہ، کلیلہ و دمنہ، ہزار افسانہ، سندباد نامہ اور تاج نامہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ساسانیوں کے زمانہ میں کتابخانے بھی تھے جن میں مشہور ترین کتابخانہ نیشاپور کا تھا۔

فارسی کی قدیم ترین قلمی کتاب جو اخلاف تک پہنچی ہے وہ "الابنیہ عن حقائق الادویہ" ہے، جو ابو منصور ہروی کی تصنیف ہے اور پانچویں صدی ہجری کے مشہور شاعر اسدی طوسی کے خط میں ہے یہ کتاب جو ایران کی نیشنل لائبریری میں محفوظ تھی، اسی نسخہ کو اساس بنا کے اسے شائع کر دیا گیا ہے۔

ایران میں مطبع کو اب یہ لوگ چاپ خانہ کہتے ہیں! پہلا فارسی چاپ خانہ مرزا زین العابدین کے توسط سے تبریز میں سال ۱۲۲۷ھ میں قائم ہوا اور تہران میں ۱۲۳۹ھ میں۔ تہران کی چھپی ہوئی پہلی کتاب کی تاریخ ۱۲۵۹ھ ثبت ہے۔ اس وقت چاپ خانہ کے بجائے باسمہ خانہ کہلاتا تھا جس کے بعد مطبع اور دار الطباعہ کی اصطلاحیں چلیں اور بالآخر چاپ خانہ کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔

اس وقت صرف تہران میں دو سو کتاب فروش اور ناشر کام کر رہے ہیں (جن میں تقریباً بیس خطاً معتبر قسم کے ہیں)، تہران کا مطلب آپ ایران ہی سمجھئے اس لیے کہ دوسرے شہروں کی وہاں اب وہ اہمیت نہیں رہی ہے جو تاریخ کے کوریڈور میں بسنے والے ہم ہندوستانیوں کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے (استثنیٰ البتہ ضرور مل جائیں گے۔)

تہران میں (ان نو کتابخانوں کے علاوہ جو پچھلے دو سال میں میونسپل لائبریریوں کے انداز پر کھلے ہیں،) بیشتر پبلک لائبریریاں ہیں جن میں پارلیمنٹ کی لائبریری (کتابخانہ مجلس شورائے ملی) اور ایران کی نیشنل لائبریری (کتابخانہ ملی) ممتاز ترین ہیں۔ اگر اختصاصی قسم کی لائبریریوں کو بھی شامل کیا جائے اور ان نو میونسپل لائبریریوں کو بھی، تو تہران کے کتابخانوں کی تعداد ایک سو چار تک پہنچ جاتی ہے اچھی خاصی تعداد میں ادھر تہران کے باشندوں کی تعداد بیس لاکھ ہے لیکن لکھنے والوں نے شکایت کی ہے کہ کتابخانوں سے استفادہ کرنے والوں صفر سے کچھ ہی زیادہ ہیں (دو سب سے مشہور شہروں میں اصفہان کی فرہنگ لائبریری اور شیراز کی فارس لائبریری قابلِ ذکر ہیں)

کتابوں کی خریداری کے معاملہ میں ایران اپنے اردو سماج کے لگ بھگ ہی ہے معیاری کتابیں مشکل سے بکتی ہیں جیسی کتابوں کی مانگ ہے مگر اردو کی طرح وہ بھی دو ہزار سے لے کر دس ہزار تک زیادہ سے زیادہ ہماری ہی طرح وہاں بھی قرآن مجید اور مفاتیح الجنان سب سے زیادہ بکنے والی مطبوعات میں سے ہیں اور ان کے بعد دیوانِ حافظ دیوانِ سعدی اور رباعیاتِ بابا طاہر جو یہاں اپنے یہاں یوں سمجھ لیجیے کہ غالب، اقبال اور رباعیاتِ سرمد (جامع مسجد کی سیڑھیوں پر)

پھر جیسا کہ اپنے یہاں کا دستور ہے پرانے قصے داستانیں اور کہانیاں چلتی ہیں مختار نامہ، چہل طوطی، امیر ارسلان، حسین کرد شبستری اور سکندر نامہ (مقبول ترین افسانوی کتابوں میں سے ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں عوام ذوق شوق سے سنتے سناتے ہیں (اپنے یہاں کے قصہ چار درویش، حاتم طائی، قصۂ امیر حمزہ (ماخوذ از داستان امیر حمزہ) اور بعض اور چھوٹے موٹے قصے جیسے عورت ذات کا قصہ وغیرہ جو ہر میلہ میں ایک چھوٹی سی کتاب فروش کی دوکان پر سیکڑوں کی تعداد میں نکل جاتے ہیں۔)

سب سے قیمتی کتاب جو پچھلے دنوں میں تہران میں چھپی ماہر ایرانیات فرانسیسی مصنف گیرشمن کی کتاب "تختِ جمشید" ہے جو صرف پانچ سو چھپی اور قیمت پانچ ہزار ریال (تقریباً پانچ سو روپے) ہمارے یہاں کی سب سے قیمتی کتاب غالباً سردار جعفری کے نفیس ایڈیشن ہیں)

مطبوعات کی زیادہ کھپت تقریباً پچاس فیصدی، تہران میں ہوتی ہے اور باقی نصف پورے ایران میں۔ اس حساب سے کتابیں پڑھنے والوں

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مراسلات

آغا اشہر لکھنوی

پروفیسر آغا اشہر لکھنوی جنھیں آج مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑتے ہیں کل تک ہمارے درمیان موجود تھے اور یقین نہیں آتا کہ ایک مختصر سی بیماری ہمارے ان کے درمیان جدائی کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دے گی جس کا مشیت الٰہی ہے۔

اشہر صاحب مرحوم جن کا پورا نام یوسف مسیح تھا اور عرفیت سید منیر آغا تھی رہنے والے تو وہ لکھنؤ کے تھے لیکن اپنی زندگی کے کم و بیش پچاس سال سیتاپور میں گزار کر سیتاپور کو انھوں نے اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ نہایت ہی مرنجاں مرنج، وضعدار، خلیق، ملنسار اور بہترین علمی قابلیت کے مالک تھے آپ نے علوم معقولات رامپور کے مدرسہ عالیہ میں علامہ ارادحسین شادانی بلگرامی اور منقولات بلند پایہ عالم مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی سے حاصل کیے تھے۔ شعر و سخن میں پیارے صاحب رشید سلسلۂ ناسخ کے ایک بلند مرتبہ استاد و شاعر سے تلمذ تھا اور لکھنؤ کے اس ادبی اسکول سے تعلق رکھتے تھے جس نے سید حسین مرزا عشق، محمد مرزا انس، تعشق لکھنوی جیسے یگانۂ روزگار صاحب فن و کمالات شخصیتوں کو جنم دیا، اور اسی روحانی تعلق کی بنا پر آپ نے "حیات رشید" کی ترتیب دی جو تاریخ ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور جو انھیں تحقیق و ریسرچ کی دنیا میں زندہ رکھے گا اور یہی ان کا سب سے اہم ادبی کارنامہ ہے۔ حیات رشید طبع ہو چکی ہے اور علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔

اشہر صاحب اس صدی کے ان تمام ادبی معرکوں میں سنجیدہ رول ادا کر چکے تھے جو عزیز لکھنوی اور یاس عظیم آبادی کے درمیان عرصہ تک مابہ نزاع بنے رہے۔

اشہر صاحب کی علمی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے ہوا یوپی کے مختلف اضلاع میں پرشین ٹیچر کی حیثیت سے درسی خدمات انجام دیتے رہے تخمیناً ۲۲-۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ اسکول سیتاپور میں بحیثیت پرشین ٹیچر تشریف لائے اور یہاں کے علمی ادبی ماحول میں کچھ ایسا رس بس گئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

سیتاپور کے زمانہ قیام میں اشہر صاحب کی شادی سیتاپور کے ایک عظیم ادبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے خسر منشی علی محمد تقی سیتاپوری نہ صرف ایک بلند پایہ عالم تھے بلکہ دنیائے ادب کے اس نامی گرامی خاندان سے منسلک تھے جس نے اردو جیسی مقبول عام زبان کا سنگ بنیاد رکھا تھا وہ عظیم شخصیت تھی علامہ سیتاپوری اکرام علی کی جنھوں نے اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے فورٹ ولیم کلکتہ میں بیٹھ کر میر امن دہلوی، مرزا علی لطف، حیدر بخش حیدری اور للولعل کوی کے دوش بدوش اس نئی زبان کو خواص کے محلوں سے نکال کر عوام کے دلوں میں جگہ دلوائی اور اس کو عوامی زبان بنایا۔

اشہر صاحب لسان القوم صفی لکھنوی کی قائم کردہ معیار پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے اور اس صدی کی پہلی دہائی میں جس عظیم ادبی تحریک کا احیاء لکھنؤ میں ہوا تھا اس کی عملی جد و جہد میں وہ ہمیشہ اپنے دوسرے معاصرین کے ساتھ رہے۔ صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی، محشر لکھنوی، علی محسن اثر لکھنوی، مرزا رسوا، شہید لکھنوی، حسن صاحب بلیغ، منے آغا فاضل، حکیم منے آغا آفتاب، اور جانے کتنے لکھنوی ارباب کمال اشہر صاحب کے ان مخلص دوستوں میں سے تھے جن کی یاد مرتے دم تک ایک کسک اور ٹھنڈی آہ بن کر ان کے لبوں پر آتی رہی۔ چکبست و شرر کا ہنگامہ خیز ادبی معرکہ ان کی نگاہوں کے سامنے گذرا۔ امیر اللغات کی عظیم ادبی و فنی بحث ان کے سامنے اٹھی اور ختم ہوئی انھوں نے دولہا صاحب عروج کا زمانہ بھی پایا اور شبلی نعمانی کا دور بھی شاد عظیم آبادی سے بھی ان کے مراسم تھے اور سائل دہلوی سے بھی قریبی تعلقات۔ ان کی ہمہ گیری، ہمہ دانی سراپا ادب تھی اور ایک ایسی بزم ادب جس کے بارے میں اب حرف یہی کہا جا سکتا ہے۔

دنیا چلی گئی مری دنیا لیے ہوئے

ابھی چند ہی سال ہوئے ہوئے گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی سے ریٹائر ہونے کے بعد سیتاپور اپنے وطن ثانی پہونچے تھے اور ایک پرسکون گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے تھے لیکن موت اسے بھی نہ دیکھ سکی۔ اور اس سکوت کو ایک سکوت ابدی سے بدل دیا۔

اشہر صاحب تخمیناً مطبوعہ و غیر مطبوعہ ایک درجن کتابوں کے مصنف و مولف تھے جن میں حیات رشید، تذکرۃ الذاکرین، مجالس المومنین، زینت کربلا، غم غلط، گاہا گاہ اور ایک غیر منقوط عربی قصیدے کا فنکارانہ غیر منقوط منظوم ترجمہ بھی شامل ہے اس کے علاوہ غزلیات، قطعات، قصائد، رباعیات، تاریخ اور مضامین کے کچھ مجموعے اور بھی ہیں جو ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آسکے۔

سیتاپور میں گذشتہ چند سال سے انھوں نے اگرچہ ایک خاموش زندگی اختیار کر لی تھی لیکن علم و ادب سے جو فطری لگاؤ تھا اس کے تقاضوں کو بہرحال کم و بیش پورا کرتے رہے مشاعروں میں شرکت کم کرتے تھے پھر بھی احباب کے اصرار پر جب کبھی شریک بزم ہوتے تو سامعین ان کی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی کے ایسے نقوش لے کر اٹھتے کہ جن کا چرچا دلوں تک رہتا...

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(رمی سیتاپوری)

امانت کی اندر سبھا

۸ دسمبر ۱۹۶۶ء کے ہماری زبان میں جناب عبدالعلیم آسی

نے سید محمد عقیل صاحب کی جس "جانبداری" کی تعریف کی ہے اس کے لیے ناؔمی صاحب عقیل صاحب سے زیادہ قابلِ تعریف ہیں۔ ناؔمی صاحب عقیل صاحب کے مضمون کی طرف اس لیے متوجہ ہوئے کہ اس میں ان کا ذکر آگیا تھا اور وہ اپنے بیان کو اپنی صفائی تک محدود رکھتے تو نامناسب نہ تھا۔ عقیل صاحب کے مضمون میں چند باتیں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے خلاف تھیں تو چند ناؔمی صاحب کے خلاف۔ اگر ناؔمی صاحب سے متعلق بیانات غلط ہو سکتے ہیں تو پروفیسر صاحب سے متعلق بیانات کا غلط ہونا ناممکن تو نہیں؟ ناؔمی صاحب اس پہلو پر بھی غور کر لیتے تو یہ نہ کہتے کہ:-

"ڈاکٹر عقیل نے پروفیسر رضوی کے دعووں کو غلط ثابت کرنے کے بعد میری طرف بھی توجہ فرمائی"

پروفیسر صاحب کے "دعووں" کو غلط ثابت کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے اتنی ہی کاوش اور وسعتِ نظر کی ضرورت ہے جو پروفیسر صاحب کی تحریروں میں نظر آئے گی اور اس جستجو کے بعد بھی شاید اس سے زیادہ ممکن نہ ہو کہ چند سرسری باتوں میں ترمیم و تنسیخ کر دی جائے۔ یہ پروفیسر صاحب کو اپنے نظریات کے غلط ثابت ہونے کا اندیشہ ہوتا تو خود متوجہ ہوتے۔ وہ خاموش بیٹھے ہیں اور ہم ان کی طرف سے کچھ کہنا پسند نہیں کرتے۔

عقیل صاحب بھی خاموش ہیں حالانکہ ناؔمی صاحب نے چند باتیں ان کی طرف سے بھی فرض کر لی ہیں ملاحظہ ہو:-

"پروفیسر رضوی کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کی اندر سبھا دیکھ کر امانت نے اپنی اندر سبھا لکھی۔ یہ نظریہ بھی ڈاکٹر عقیل نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ جو دلائل امانت کے لیے ہیں وہی واجد علی شاہ کے لیے:"

عقیل صاحب یا پروفیسر صاحب کسی نے بھی واجد علی شاہ کے رہسوں کو اندر سبھا نہیں کہا ہے جو دلائل امانت کے لیے تجویز ہوئے ہیں پروفیسر صاحب کی کتاب "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" سے ماخوذ ہیں اور ان کا اطلاق واجد علی شاہ پر نہیں ہوتا کیونکہ واجد علی شاہ کے رہس اندر سبھا نہیں ہیں۔

ناؔمی صاحب کے علم میں:-

"پرتگالیوں، ڈچ، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں سے کسی نے بھی لکھنؤ کیا پورے اودھ میں کوئی تھیٹر تعمیر نہیں کیا"

موصوف نے اپنے بیان کو لکھنؤ تک محدود رکھا ہوتا تو شاید غلط نہ ہوتا۔ کانپور اگرچہ واجد علی شاہ کے زمانے میں اودھ کی سرحد پر تھا لیکن اس شہر کو اس زمانے کا "گیٹ وے آف اودھ" کہنا اتنا ہی درست ہے جتنا بمبئی کو "گیٹ وے آف انڈیا" کہنا۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۷ء یعنی ۱۵ سے ۲۵ برس کے سن تک واجد علی شاہ کئی دفعہ کانپور گئے اور ناؔمی صاحب اگر انگریز سیاح ایما رابرٹس کا سفرنامہ دیکھیں تو معلوم ہو کہ ۱۸۳۷ء سے پہلے کانپور میں تھیٹر قائم ہو چکے تھے اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام کر رہے تھے[1] یہ کتاب اتنی نایاب نہیں اور اگر کہیں اور نہ ملے تو نیشنل لائبریری (کلکتہ) میں مل جائے گی۔

ناؔمی صاحب کا خیال ہے کہ:-

"واجد علی شاہ نے کسی چبوترے کا نام رہس منزل رکھ دیا"

چبوترے میں[2] دروازے نہیں ہوتے اور لکھنؤ کی رہس منزل کے لیے واجد علی شاہ کا یہ بیان توجہ کے قابل ہے:-

"اے خواجہ ذرا اٹھ کر دروازہ رہس منزل کا کھول[3]"

واجد علی شاہ کے رکھے ہوئے نام نام ہی نہ ہوتے تھے بلکہ ان سے اس شے کی کچھ کیفیت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ رہس منزل بھی ایک ویسا ہی نام ہے اور نہ صرف لکھنؤ میں بلکہ لکھنؤ اجڑنے کے بعد کلکتہ میں وہ نگار خانے پھر تعمیر ہوئے تو ان کے نام بھی وہی رکھے گئے جن سے ماضی کی کچھ حسین یادیں وابستہ تھیں۔

لکھنؤ کے نگار خانوں کے نام ہمعصر مورخین نے اور کلکتہ کے نگار خانوں کے نام وہاں کے واقف کاروں نے بیان کیے ہیں اور یہ نام اگر کوئی اہمیت رکھتے ہوں تو انھیں تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ رہس منزل اور شاہ منزل یہ دو نام دونوں جگہ نظر آئیں گے۔ رہس منزل کس کام کے لیے بنی تھی یہ مہتاب الدولہ بہادر درخشاں کے قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ؎

رہس منزل ہے پریوں کا اکھاڑہ
عجب کمرہ سلیمانی بنا ہے
درخشاں جلوہ گر ہے سال تعمیر
مکانِ جشنِ خاقانی بنا ہے[4]

درخشاں نے ۱۲۹۴ھ کو سال تعمیر بتایا ہے لیکن اس میں

SCENES AND CHARACTERISTIC OF HINDUSTAN
BY EMMA ROBERTS PUBLISHED BY ALLEN & CO
LONDON (1837) VOL. I. PP. 44-45

[1] ایما رابرٹس کی کتاب سینز اینڈ کیریکٹرسٹکس آف ہندوستان مطبوعہ ایلن اینڈ کمپنی، لندن، ۱۸۳۷ء جلد ۱ صفحہ ۴۴، ۴۵

[2] تاریخ غ۔ ا۔ صـ ۲۳

[3] بنی مطبوعہ مطبع سلطانی، کلکتہ، صـ ۳۸۳

خود بادشاہ سلامت کی کوئی خاطر ملحوظ تھا ہے۔ رہس کا کام اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا[۱] اور ساتھ ہی وہ عمارتیں بھی[۲] تیار ہو چکی تھیں جن کے لیے درخشاں نے ۲۹ قطعات تاریخ کہے اور سنہ ہر ایک کے لیے دے دی رکھا[۳]۔

کلکتہ کی رہس منزل شاہ منزل کا ایک ٹکڑا تھی اور اس نام شاہ منزل سے عمارتوں کا وہ تمام سلسلہ مراد ہوتا تھا جو دریائے بھاگیرتی (ہگلی) اور شاہراہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا[۴] رہس منزل لب دریا واقع تھی اور خاص بادشاہ کی رہائش گاہ[۵] سلطان خانے کی عمارت سے نزدیک تر تھی۔ سلطان خانے اور رہس منزل کے درمیان جو دروازے تھے ان کو اگر بند کر دیا جاتا تو اس کا سلطان خانے سے کوئی تعلق نہ رہتا ورنہ اسے سلطان خانے ہی کا جزو دیکھا جاتا تھا[۶]۔ رہس منزل ایک منزلہ عمارت تھی اور اس کا اندرونی حصہ کافی کشادہ تھا لیکن اس کے بیرونی حصہ میں عمارت سے قریب تر اونچی دیواریں تھیں جن کے سبب رہنے کے لیے یہ موزوں مقام نہ تھا[۷]۔

رہس منزل اور چند اور متعلقہ عمارتوں کی تصویریں اور چند دوسرے بیانات اس زمانے کی یادگار ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس عمارت کی نیو بھی کھد گئی جس کی دلکشی فلم کمپنی والوں کو وہاں کھینچ لائی تھی اور اس کی پرانی روایت ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھی۔ خاموش فلم ترکی حور کے چند شاٹ یہیں لیے گئے ہیں لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب عمارت کھنڈر بن چکی تھی اور فلم کمپنی والوں نے اسے حسب ضرورت اپنے کام کا بنا لیا تھا[۸]۔ کلکتہ کی رہس منزل اس وقت تعمیر ہوئی جب بادشاہ کی ماہانہ آمدنی ایک لاکھ روپے بھی نہ تھی۔ عمارتوں کی تیاری کے لیے جواہرات فروخت کیے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود رہس منزل کی جو منزلت تھی وہ انھیں بیانات سے ظاہر ہے۔ شاہ منزل کی رہس منزل کے مقابلے میں قیصر باغ کی رہس منزل کا کیا پوچھنا جب بادشاہ تقریباً ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپے سال کے مالک تھے اور جواہرات کا کوئی حساب نہ تھا۔

(کوکب قدر سجاد علی مرزا)

۱؎ ایضاً صفحہ ۳۰۸ سے صفحہ ۳۲۱ تک جلسوں کی تیاری کا حال ملاحظہ ہو۔
۲؎ ایضاً صفحہ ۳۴۵ سے صفحہ ۳۸۳ تک قطعات ۳؎ صفحہ [illegible] تک ۴؎ کلکتہ ہائی کورٹ کی اپیل نمبر ۲۲ سال ۱۹۰۰ء (مطبوعہ) مقدمہ پرنس زمیر دل جاہ بنام نواب سرور محل بیگم صفحہ ۱۲۱ نواب سرور محل بیگم بنت مرزا جہاں قدر کا حلفیہ بیان ۵؎ ایضاً صفحہ ۹۹ مرزا محمد مقیم ابجی پرنس آسمان جاہ کا حلفیہ بیان ۶؎ ایضاً صفحہ [illegible] سعیدی بیگم مسعود اہل محل کا حلفیہ بیان ۷؎ ایضاً صفحہ ۱۲۳ نوبی چند ریورال ہائی کورٹ اٹرنی کا حلفیہ بیان ۸؎ خود ہمارے ایک صاحب نے اس فلم کی شوٹنگ میں کچھ کام کیا تھا۔ یہ صاحب ابھی زندہ ہیں اور یہ باتیں انھیں معلوم ہوئیں۔ انھوں نے فلم کمپنی کا نام نہ تحریر بتایا۔ فلم سے متعلق اگر کوئی صاحب مزید معلومات فراہم کر سکیں تو میں مشکور رہوں گا۔

لفظی تحقیق

شکور:۔ پسندیدہ کے معنی میں ہے۔ کما فی التنزیل کان سعیکم مشکورا۔ شکرگذار کے معنی میں لکھنا غلط ہے۔

نگہت:۔ غلط ہے "نکہت" کاف تازی کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ یہ لفظ عربی ہے لہٰذا کاف فارسی کے ساتھ لکھنا درست نہیں۔

حسب الفرمائش:۔ فرمائش فارسی لفظ ہے اس کے قبل "الف لام" کا لانا درست نہیں۔

جمادی الاول:۔ غلط ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ہونا چاہیے۔ کیونکہ محاورۂ عرب کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ جمادی مونث ہے۔ اس کی صفت بھی قاعدہ کی رو سے مونث ہی چاہیے

جمادی الثانی:۔ جمادی الثانیہ ہو سکتا ہے مگر ثانی کا اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں ثالث بھی ہو اور یہ یہاں نہیں اس لیے آخرہ ہی ہوگا۔ البتہ ربیع اول اور ربیع الآخر لکھنا صحیح ہے۔

فی الواقعی:۔ فی الواقع یا واقعتہً کے عوض میں لکھنا درست نہیں۔ "فی" حرف جار "واقع" مجرور پھر اس میں فارسی کی یائے مصدری لگا کر حالت مصدری میں دکھلانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

احبابوں:۔ غلط ہے۔ احباب تو خود جمع ہے پھر جمع کی جمع لانا کیا معنی؟

ہر چیزوں:۔ غلط ہے ہر چیز ہونا چاہیے جب ہر شروع میں موجود ہے تو اس کے بعد اسم جمع کیونکر آ سکتا ہے؟

نسلاً بعد نسلاً:۔ غلط ہے اس کو نسلاً بعد نسلٍ ہونا چاہیے اسی طرح وراثتہً بعد وراثتہٍ، بطناً بعد بطنٍ ہوں گے۔

راشی:۔ رشوت دینے والا۔ رشوت لینے والے کو مرتشی کہتے ہیں۔

(مناظر عاشق ہرگانوی)

معاصر

اُردو کی حیثیت

(معاصر انگریزی روزنامہ "انڈین ایکسپریس" نے اپنی ۱۹ جنوری کی اشاعت میں مندرجہ بالا عنوان سے ایک اداریہ شایع کیا ہے۔ اس اداریے میں اردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان مطالبات کی حمایت کی ہے جو اردو دوست ریاستی سرکاروں اور مرکزی حکومت سے ایک مدت سے کر رہے ہیں۔ مذکورہ اداریہ کا ترجمہ قارئین 'ہماری زبان' کی دلچسپی کے لیے درج ذیل ہے۔ (ادارہ)

اس وقت اگر اخباری رپورٹوں کے مطابق صدارتی اعلان جاری کرکے اردو کے متعلق دستوری یقین دہانیوں کو عملی شکل دے دی گئی تو گمان غالب یہی ہے کہ مخالف پارٹیاں اسے برسر اقتدار جماعت کی الکشنی چال قرار دیں گی۔ اس لیے کہ یہ چیز ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کی جارہی تھی جو یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اردو کو ان ریاستوں میں جہاں کے باشندوں کی ایک معقول تعداد اردو بولتی ہے، اسے علاقائی زبان یا دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اس مطالبہ پر مشتمل ایک میمورنڈم چند سال پہلے انجمن ترقی اردو کی جانب سے (جس نے اس پر ہزاروں لاکھوں دستخط بھی کرائے تھے) اس وقت کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش بھی کیا تھا یو۔پی اور راجستھان کی حکومتوں نے اس کے جواب میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے پر تیار ہیں، جہاں اس قسم کا مطالبہ ہوگا اور حکومت سے مراسلت کرنے اور عدالتی فیصلوں اور درخواستوں میں بھی اردو کو جگہ دی جائے گی۔ بہار اور آندھرا کی حکومتوں نے بھی حال میں اسی قسم کے اقدامات کیے ہیں۔

اپریل ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ کے ۱۰۴ ممبران کی طرف سے ایک تحریر وزیر اعظم کو پیش کی گئی تھی۔ جس میں اردو والوں کے پرانے مطالبے کو دہراتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ مذکورہ بالا چیزیں کافی نہیں ہیں۔ ان ممبران پارلیمنٹ نے ایک دوسری دلیل اردو کو یو۔پی، بہار، راجستھان، دہلی، آندھرا اور پنجاب میں سرکاری زبان قرار دینے کے حق میں یہ دی تھی کہ اب تک اردو کے لیے جن سہولتوں کا وعدہ چند سال پہلے کیا گیا تھا ان پر یا تو پوری طرح عملدرآمد نہیں ہوا یا ہوا تو انتہائی غیر اطمینان بخش طور پر۔ اس بات کی تصدیق لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ سے بھی ہوگئی۔

ہندوستان کی وزارت تعلیمات نے اس قسم کے صدارتی اعلان کی سفارش اس لیے کی تھی کہ وزیر اعظم نے یہ معاملہ رائے لینے کے لیے اس وزارت کے پاس بھیجا تھا۔

فخر الدین علی احمد صاحب جنھوں نے کچھ عرصہ ہوا یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت یو۔پی اپنے یہاں کے اردو بولنے والوں کی شکایات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرے اب اس تجویز کو غالباً اس لیے ترک کر دیا ہے کہ انھیں یہ محسوس ہو گیا ہے کہ اس کارروائی میں نہ صرف وقت ضائع ہوگا بلکہ اگر اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی تو اس میں اور زیادہ نقصان پہونچ کر رہے گا اور اس کی دوسری وجہ کھلی ہوئی یہ ہے کہ خود حکومت یو۔پی بھی اس تجویز کے حق میں نہیں ہے۔

یو۔پی میں تحقیقات کا یہ مطالبہ اس بنا پر بھی پیش ہوا تھا کہ دوسری حکومتوں خصوصاً آندھرا، راجستھان اور بہار کی گورنمنٹوں کی روش یو۔پی کے دیکھتے اردو والوں کے معاملہ میں اور زیادہ پیش قدمی کی تھی اس تجویز پر کہ ایسی قانونی دفعہ بڑھائی جائے جس کی رو سے اردو کو ایک قومی زبان قرار دیے جانے کے بارہ میں یقین دہانیاں عملی شکل اختیار کر سکیں حکومت بہار اور دلی کے ارباب انتظام کا رویہ جناب فخر الدین علی احمد کی موافقت میں تھا لیکن یو۔پی کی گورنمنٹ نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا۔

اردو ایک مالا مال زبان ہے جو دو تہذیبوں کے امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے وہ دہلی اور یو۔پی میں پیدا ہوئی اور وہیں اس کا نشو و نما ہوا۔

اس لیے یہ بات صحیح ہے کہ یہ زبان پاکستانی سے کہیں زیادہ ہندوستانی زبان ہے پاکستان میں دو سرکاری زبانوں میں سے ایک مانی جاتی ہے، حالانکہ وہ وہاں کے دونوں خطوں میں سے کسی ایک کی بھی زبان نہیں۔

اردو کا قیمتی ورثہ اس قابل ہے کہ اس کا پورا تحفظ کیا جائے اس کے خلاف تعصب کا جو جذبہ زمانۂ ماضی سے چلا آرہا ہے اسے آج کے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ ملنی چاہیے لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کی تعلیم اور اس کے استعمال کے لیے سخت اور موثر تدابیر اختیار کی جائیں اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس بارہ میں لسانی کمشنر کی رائے پر عمل نہ کیا جائے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا مطالبہ

اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے

انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس میں اردو کے متعلق جو قرارداد منظور کی گئی اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے:۔

۱۔ اردو دستور ہند کی مسلمہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔

۲۔ انتہائی محتاط سرکاری تخمینہ کے مطابق بھی اردو شمالی ہندوستان میں دو کروڑ سے زیادہ باشندوں کی مادری زبان ہے۔

۳۔ اردو کو اس کے اپنے وطن دہلی، اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش راجستھان اور ہریانہ میں، گذشتہ دس برسوں سے اس کے جائز مقام سے محروم کر دیا گیا ہے اس کی وجہ شاید وہ بدنجاذ سیاسی فضا ہے جو تقسیم ملک کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اردو کو نظم ونسق اور تعلیمی نظام سے باقاعدگی کے ساتھ رفتہ رفتہ ختم کر دیا گیا ہے۔

۴۔ اردو پانچ صدی سے زیادہ کی عظیم اور نمایاں ادبی روایات کی حامل ہے۔

۵۔ اردو کی ان نمایاں خصوصیات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو ہندی سے بہت زیادہ قریب ہے ہندی اور اردو دونوں کا ماخذ اور ماضی مشترک ہے۔

۶۔ یہ بڑی بدبختی ہے کہ ان دو بہنوں زبانوں میں سے جو ہمارے خیال کے مطابق "کھڑی بولی" کے ایک اور اسی ذریعہ سے پیدا ہوئی ہیں ایک کو اس طرح کچل دینے سے ہندی اور اردو دونوں کے صحت مند خطوط پر نشوونما کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔

۷۔ ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی اس کانفرنس کی یہ پرخلوص خواہش ہے کہ ان دونوں زبانوں کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور ایک دوسرے کی نشوونما میں مدد دے سکیں۔

۸۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم مندرجہ بالا ریاستوں کی حکومتوں اور حکومت ہند سے سفارش کرتے ہیں کہ

ان طلبہ کو جو اردو کو اپنی مادری زبان قرار دیتے ہیں ابتدائی اور سکنڈری تعلیم اردو میں حاصل کرلے اور ہندی کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھنے کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں۔

ان کے تمام محکموں میں اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں۔

اور اگر کوئی خواہش کرے تو تمام دستاویزوں کی نقلیں اردو میں بھی مہیا کی جائیں۔

۹۔ اگرچہ مذکورۂ بالا ریاستوں میں سے بعض نے ان سفارشات کو جزوی یا کلی طور پر قبول کر لیا ہے لیکن نظم ونسق کی سطح پر ان پر عمل نہیں کیا گیا ہے بلکہ بعض رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔

۱۰۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہماری سفارشوں کو، ان تمام مذکورہ بالا، ریاستوں میں یکساں طور پر قبول کیا جائے اور انتظامی مشینری کی طرف سے جو رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے موثر قدم اٹھائے جائیں۔

۱۱۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دینے سے ایک صحت مند فضا پیدا ہو جائے گی اور اردو اور ہندی کے درمیان غیر صحت مند مخالفت ختم ہو جائے گی۔

انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ

وسط فروری میں یوم غالب منایا جائے گا

دہلی۔ انجمن ترقی اردو دہلی اسٹیٹ کے زیر اہتمام اس سال یوم غالب کی تقریبات ۱۵ اور ۱۶ فروری کو منائی جائیں گی۔ پروگرام کا آغاز بزم مقالات سے ہوگا بعد ازاں ساڑھے چھ بجے شام سے طرحی مشاعرہ شروع ہوگا جو کہ آل انڈیا ریڈیو سے ریکارڈ کیا جائے گا۔ یوم غالب کے سلسلہ میں ضروری انتظامات کئے گئے ہیں مجلس عاملہ نے اضلاع اور ریاستی انجمن کے انتخابات کے بارے میں طے کیا کہ مارچ کے آخر تک یہ انتخابات مکمل کیے جائیں اس سلسلہ میں مرکزی انجمن کا ایک مراسلہ زیر بحث آیا۔

"تراشیدہ" کی رسم اجراء

اردو کے ممتاز نوجوان شاعر شاذ تمکنت کے پہلے مجموعۂ کلام "تراشیدہ" کی رسم اجراء راجہ جانکی پرشاد صدر اردو مجلس کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اردو ہال میں منعقدہ نئے سال کی اس پہلی ادبی تقریب کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ جس میں ادیبوں، دانشوروں اور دیگر ممتاز شخصیتوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ شاذ تمکنت کی شاعری اور شخصیت پر جناب اختر حسن، مغنی تبسم، وحید اختر اور نثار احمد فاروقی نے تقاریر کیں اور مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں شاذ کی شاعری کا بے لوث تجزیہ کیا اور شاذ کو ایک رومان پسند شاعر ٹھہراتے ہوئے "تراشیدہ" کو جدید اردو شاعری میں بیش بہا اضافہ قرار دیا۔ اس کے بعد شاذ تمکنت اپنا منتخبہ کلام سنا کر بے حد داد حاصل کی۔ آخر میں مشہور گلوکار قمر جہاں اور اقبال قریشی نے ساز پر شاذ تمکنت کی غزلیں پیش کیں۔ ادارہ صبا کے زیر اہتمام منعقدہ کی گئی یہ خوشگوار تقریب مدیر "صبا" جناب سلیمان اریب کے شکریے پر اختتام کو پہنچی۔ (ب-ا)

> **ہماری زبان**
> سے خط وکتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

صفحہ ۹ سے آگے

اس رخ کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ آپ اندازہ کریں، اس عبارت میں بات کا بتنگڑ ہے، الفاظ شاندار الفاظ کا محض میلہ سا لگا ہے اور مقصد یا اصل بات اس میلے میں گم ہے۔

انشا پردازی ادیب کا ایک عمدہ وصف ہے ایک اہل قلم کی یہ ایسی لیاقت ہے جس سے الفاظ، فقرے، جملے، عبارت اور پوری تحریر میں دلگیری و جاذبیت آجاتی ہے۔ مگر ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ یہ وہ کاوش نہیں جو تحریر کی حسن کارانہ تشکیل کا سبب کہی جائے وہ حسن کارانہ تنظیم جس میں زبان خیال کی محرم و ہمدم ہوتی ہے۔ وہ حسن کارانہ تنظیم جو تحریر کی صورت گری ہے۔ ایسی تمام تحریریں جنھیں ہم صنف ادب کا مقام دیتے ہیں، نہ یہ انشا پردازی کا حاصل ہیں اور نہ یہ عبارت آرائی کا نتیجہ ہیں۔ ان تحریروں کی ادب میں مخصوص "صنفی" حیثیت ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں خیال و اظہار کی منزلیں ہوتی ہیں جن میں اختلاط و اتحاد شرط اول ہے۔ خیال خواہ کسی قسم کا ہو، مرئی نہیں ہوتا، یہ وہ نگینہ نہیں جسے ستھرا غلاف پہنا کر چشم زدن میں زینت بستر بنا دیا جاتا ہے۔ ادیب کے لیے ایسی سہل کاری ممکن نہیں۔ ادیب کے یہاں خیال ہوتا ہے اور اظہار خیال کا سلیقہ بھی۔ یہ خیال پیش پا افتادہ بات جیسا حقیر و کم مایہ نہیں ہوتا۔ یہ گراں قدر ہوتا ہے، نیا ہوتا ہے اور انوکھا بھی۔ اس خیال کی آمد، آمد ناگہاں ہوتی ہے اور پر از ہیجان۔ وقت اظہار اسے پر شور گھڑیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے آمد خیال اور اظہار خیال کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے اور طویل فاصلہ ادیب کے لیے یہ درمیانی وقفہ سخت کرب انگیز و ہیجانی ہوتا ہے۔ وقت اظہار اسے ضبط و قرار اور غور و فکر کی صبر شکن ساعتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انشا پردازی یا عبارت آرائی میں اہل قلم اس نوع کے عالم اضطرار و انتشار سے نہیں گزرتا۔ انشا پردازی اہل قلم کا کھیل ہے۔ ادب الفاظ کی بازی گری یا خیال کی تحریری تزئین و آرائش نہیں۔

ادب قلم کا آرٹ ہے جس کا نہایت موزوں اور مناسب نام "قلم کاری"[1] (PENMANSHIP) ہے۔ ادب ایک ماہر اہل قلم کی اعلیٰ لیاقت ہے یہ افکار و تاثر کی قلم بندی کی باکمال لیاقت ہے۔ ایسی غیر معمولی صلاحیت جو واقعات، خیالات یا کوائف کی تشکیلی صورت گری ہوتی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ـــ "قلم کاری تحریر کی صنفی ساخت" ـــ مطبوعہ رسالہ نیا دور، جون ۱۹۹۲ء

صفحہ ۶ سے آگے

کی تہران چھوڑ کے تعداد پورے ایران میں اتنی ہی ہے جتنی صرف تہران میں (اس قسم کا کوئی جائزہ ہمارے یہاں ہندوستان میں شاید نہیں لیا گیا پبلشر حضرات اس میں دلچسپی لیں تو اس میں اعداد و شمار فائدہ سے خالی نہ ہوں گے)، اور ایران میں تہران کے بعد اصفہان کا نمبر آتا ہے پھر شیراز، مشہد، رشت اور تبریز۔

تہران میں ہر سال ہزار سے بارہ سو تک نئی کتابیں چھپتی ہیں اور اوسطاً ہر کتاب کے تین ہزار نسخے۔ انجمن سے درخواست ہے کہ میرے اس اندازے کے بعد اردو کی ہر سال کی مطبوعات کی اوسط تعداد درج کر دیں میرا خیال ہے کہ یہ تعداد ہندوستان میں اتنی ہی ضرور ہوگی، ۱۹۶۲ء سے کتابخانۂ ملی نے "انتشارات ایران در سال" کے عنوان سے ہر سال کی مطبوعات کی ایک فہرست چھاپنی شروع کی ہے[1] میرے پیش نظر ۱۳۴۳ء کا شمسی کیٹلاگ ہے جو اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے اسے مصنف وار اور فن وار ترتیب دیا ہے اور آخر میں عنوانوں کی انڈکس دے دی ہے۔ بالکل اسی انداز پر سال بہ سال اردو کی مطبوعات کا ایک کیٹلاگ انجمن تیار کرا سکتی ہے جو اگر کتابوں کی مدد سے نہیں تو ایک اور ذریعہ سے ترتیب دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے امریکی کانگریس لائبریری کی ہندوستانی "ایکیشن لسٹ" (فہرست اندراج) جو ہر ماہ دہلی سے شائع ہو رہی ہے اور جس میں نوے فیصدی کتابیں آجاتی ہیں۔

---

[1] سب سے پہلے تیرہ سال کا مکمل سیٹ سال بہ سال "انجمن کتاب" والے چھاپتے رہے ہیں مگر اس میں صرف اہم کتابیں ہوتی تھیں۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا